اکائی 8 خواجہ حیدر علی آتشؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات

ساخت

8.1 اغراض ومقاصد
8.2 تمہید
8.3 خواجہ حیدر علی آتشؔ کی شاعری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ
8.3.1 حالاتِ زندگی اور ذہنی تربیت
8.3.2 آتشؔ کا فن
8.3.3 متن اور اس کی تشریح
8.4 آپ نے کیا سیکھا
8.5 اپنا امتحان خود لیجیے
8.6 سوالات کے جوابات
8.7 فرہنگ
8.8 کتب برائے مطالعہ

8.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- خواجہ حیدر علی آتشؔ کے حالاتِ زندگی اور فن سے متعارف ہوں گے۔
- خواجہ حیدر علی آتشؔ کے کلام کی اردو شاعری میں قدر و قیمت متعین کریں گے۔
- خواجہ حیدر علی آتشؔ کے ہم عصر شعرا سے واقف ہوں گے۔
- خواجہ حیدر علی آتشؔ کے نمائندہ کلام کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ کریں گے۔

8.2 تمہید

اُردو غزل کے چند مقبول اور ممتاز شعرا میں خواجہ حیدر علی آتشؔ کا شمار ہوتا ہے۔ دبستان لکھنو کی جب بھی بات ہوتی ہے تو سب سے پہلے شیخ امام بخش ناسخؔ اور ان کے ہم عصر خواجہ حیدر علی آتشؔ کا ذکر آتا ہے۔ ناقدین نے اکثر ناسخؔ اور آتشؔ کی شاعری کا تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے۔ آتشؔ جس وقت لکھنو میں شاعری کر رہے تھے اس وقت دہلی میں استاد شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، حکیم مومن خاں مومنؔ، بہادر شاہ ظفرؔ اور مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی شاعری کی دھوم تھی۔ ادھر لکھنو میں آتشؔ سے ذرا پہلے شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ اور انشاء اللہ خاں انشاؔ کی شاعری کے چرچے تھے۔ آتشؔ کچھ وقت تک مصحفیؔ کے شاگرد بھی رہے، لیکن بعد میں اپنی قابلیت اور ریاضت کی وجہ سے وہ خود استاد فن کے مسند پر براجمان ہوئے۔ آتشؔ کی شاعری میں بلا کی سرمستی اور روانی پائی جاتی ہے۔ وہ ایک صوفی تھے اس لیے ان کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی ہے۔ بندش کی چستی کے لئے بھی آتشؔ مشہور ہیں۔ ان کے کلام میں ایک والہانہ پن پایا جاتا ہے۔

8.3 خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ

8.3.1 حالاتِ زندگی اور ذہنی تربیت

اردو شاعری کے حوالے سے دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنو کی اصطلاحیں خوب رائج ہیں۔ دبستانِ لکھنو کی پہچان اور شان جن دو شاعروں کی بدولت بامِ عروج پر پہنچی ان کے نام شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش ہیں۔ آتش کا تعلق دلّی کے ایک صوفی خاندان سے تھا۔ ان کے والد خواجہ علی بخش نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دلّی سے فیض آباد چلے گئے تھے۔ خواجہ زادوں کے جس خاندان سے آتش کا تعلق تھا اُس میں مسندِ فقر بھی قائم تھی۔ اس خاندان میں صدیوں سے پیری مریدی کا سلسلہ جاری تھا۔ بچپن میں ہی آتش کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ وہ کچھ زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے لیکن ایک بے پروا اور آزادانہ زندگی بسر کرنے کا موقع انھیں ضرور ملا۔ بچپن سے ہی ان کے مزاج میں ایک طرح کی آزادی اور بانکپن پیدا ہو گیا تھا۔ وہ آزادانہ، رندانہ اور سپاہیانہ وضع رکھتے تھے۔ خاندان کا تمغا قائم رہے اس لئے ان کی شخصیت میں کچھ رنگ فقیری کا بھی نمایا تھا۔ کم عمری میں ہی فیض آباد سے لکھنو چلے گئے تھے جو اُس زمانے میں شعر و شاعری کا مرکز تھا۔ ہر طرف انشاء اور مصحفی کا بول بالا تھا۔ آتش بھی مصحفی کے شاگرد ہو گئے۔ لیکن استادی شاگردی کا یہ سلسلہ زیادہ دنوں نہیں چلا۔ اپنی ریاضت اور مشق سے آتش نے وہ مقام حاصل کیا کہ بہت جلد استاد شاعروں میں ان کا نام لیا جانے لگا۔

آتش نے غزلوں کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ قصیدہ یا ہجو سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ انکی غزلوں کے دو دیوان شائع ہوئے۔ پہلا دیوان خود انھوں نے ترتیب دیا تھا۔ دوسرا دیوان ان کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد رشید خلیل نے ترتیب دیکر شائع کیا۔ اس عہد کے دیگر شعراء کی طرح آتش بھی ناسخ سے متاثر تھے۔ لیکن ان کی غزلوں پر ناسخ کا اثر کم ہے۔ ناقدین نے آتش کی غزل کو مصحفی و میر کی غزل کی توسیع قرار دیا ہے۔ ان کی غزلوں میں اخلاقی مضامین بھی ہیں، زندگی کے حقائق پر تبصرے بھی ہیں اور تصوف کی بھرپور چاشنی بھی ہے۔ آتش کی شاعری وہ گُل و بلبل والی شاعری نہیں ہے جس کے لئے لکھنو خواہ مخواہ بدنام کیا جاتا ہے۔ آتش کے کلام میں عشقیہ شاعری کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

یا

مری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے
نکل چکی ہے بہت پیرہن سے بو تیری

آتش کے کلام میں ایک سرمستی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ایک روانی ہے جو اپنے ساتھ بہائے لئے جاتی ہے۔

مگر اُس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے
اُلٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

آتش کے کلام میں جو فلسفہ ہے وہ حیاتِ انسانی کا فلسفہ ہے۔زندگی اور موت کے فلسفے کو آتش ایک بے بس انسان کی شکل میں نہیں دیکھتے ہیں۔ایک وارفتگی ہے جو موت کو بھی محبوبیت عطا کرتی ہے۔

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

8.3.2 آتش کا فن

جہاں تک فن کاری کا تعلق ہے تو آتش کی مرصع سازی زمانے بھر میں مشہور ہے۔حالانکہ ناسخ کے اثر سے یا ناسخ کی برابری کرنے کے لئے آتش نے سنگلاخ زمینوں میں بھی غزلیں کہی ہیں۔لیکن اپنی خداداد تخلیقی قوتوں کی مدد سے سنگلاخ زمینوں کو بھی پانی کر کے رکھ دیا ہے۔وہ یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ:

آتش زمینِ شعر ہو ہرچند سنگلاخ
لغزش سے آشنا نہیں اہلِ سخن کے پاؤں

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ فنِ شعر میں تشبیہ واستعارہ سے شعر کے حُسن میں اضافہ ہوتا ہے۔لیکن جب یہی شاعری کا اصل مقصد قرار پائے تو اشعار تاثیر سے دور جا پڑتے ہیں۔آتش نے یہ ضرور کہا ہے کہ:

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

لیکن آتش کی شاعری صرف مرصع سازی نہیں ہے۔اس میں فکر کی بلندی ہے، جذبات کی گرماہٹ ہے۔عشق کی کارفرمائی ہے، تصوف کے مراحل ہیں۔آتش نے نشاطِ غم سے اپنی شعری کائنات کو سجایا ہے۔جس شدید داخلیت اور غم انگیزی کو صرف میر تقی میرؔ جیسا شاعر ہی برت سکا ہو اسے کسی حد تک آتش نے بھی نبھایا ہے۔تجرباتِ زندگی کی رنگارنگی اور موضوعات کے تنوع میں وہ غالبؔ کے ہم مرتبہ نہ سہی لیکن میرؔ و غالبؔ کے بعد خالص غزلیہ شاعری کے حوالے سے سب سے اہم نام خواجہ حیدرعلی آتش کا ہے۔اور جہاں تک فلسفہ تصوف کو شاعری میں پیش کرنے کا سوال ہے تو خواجہ میر دردؔ اور خواجہ حیدرعلی آتش کا نام سرِ فہرست ہے۔ان کے علاوہ حضرت آسیؔ غازی پوری اور اصغر گونڈوی کا صوفیانہ کلام بھی اردو شاعری کا عظیم سرمایہ ہے۔دراصل تصوف کو عام طور پر وہی شعراء برت سکے ہیں جو خود بھی صوفی تھے۔تصوف کے اسرار و رموز سے پوری آگاہی کے بغیر روحانی کیفیت کو بیان کرنے والی شاعری ممکن نہیں ہے۔اور تصوف کے اسرار و رموز سے آگاہی مسلسل ریاضت اور نفس کُشی سے حاصل ہوتی ہے۔پھر انسان کے باطن میں طہارت، پاکیزگی اور سوز وگداز پیدا ہوتا ہے۔خواجہ حیدرعلی بھی ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد ہی ''آتش'' بن سکے۔پھر بے خودی اور سرشاری نے ان کی شاعری کو ایک شانِ قلندری عطا کردی۔ورنہ آتش جس دور میں شاعری کررہے تھے وہاں درباری ماحول اِس قدر حاوی تھا کہ تمام شعراء نوابین اور امراء کی مدح خوانی میں مصروف تھے۔شعراء کا کام نوابین کی ہوسناکیوں کو ہوا دینا رہ گیا تھا۔ایسے میں تصوف

نے بہت حد تک اردو غزل کی آبرو رکھی۔

ہندوستان میں تصوف کے دو سلسلے ابتدا سے ہی رائج تھے۔ ایک سلسلے نے بے خودی کے اس عالم میں پہنچا دیا جہاں انسان قوتِ عمل سے محروم ہو جاتا ہے۔ دوسرا سلسلہ مولانا رومؔی کا تھا، جس کی پیروی بعد میں علامہ اقبال نے کی۔ مولانا رومؔی کا نظریہ حیات حرکی ہے۔ اس میں دنیا سے فرار نہیں بلکہ دنیا سے نبرد آزمائی کی تعلیم ہے۔ اقباؔل کا مردِ قلندر فنا کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ خودی کی بات کرتا ہے۔ لیکن آتشؔ کے کلام میں جو کیفیت ہے وہ اس سے مختلف ہے۔

منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل
بادشہ تخت سے یاں اپنے اتر لیتا ہے

یا

چھوڑ کر ہم نے امیری کی فقیری اختیار
بوریئے پر بیٹھے ہیں قالیں کو ٹھوکر مار کے

ہمارے کچھ ناقدین نے آتشؔ کی صوفیانہ شاعری کو فارسی کی صوفیانہ شاعری کے مقابلے میں رکھ کر جانچنے پرکھنے کی کوشش کی۔ نتیجتاً آتشؔ کی صوفیانہ شاعری کو وہ مقام نہ مل سکا جو اس کا حق تھا۔ لیکن جب ہم لکھنو کے تاریخی پس منظر میں آتشؔ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی صوفیانہ شاعری کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ ایسے حالات میں جب فحش خیالات کثرت سے شاعری میں بیان کئے جانے لگے۔ اردو غزل سے تصوف و اخلاق کو یکسر خارج کر کے اسے معاملہ بندی کی نذر کر دیا گیا۔ تب آتشؔ کی یہ آواز ہمیں چونکاتی ہے:

بادشاہی سے فقیری کا ہے پایہ بالا
بوریا چھوڑ کے کیا تختِ سلیماں مانگوں

یا

دو نعمتیں یہ میری ہیں، میں ہوں فقیر مست

لکھنو میں آتشؔ کے آس پاس جو ماحول تھا وہ چاپلوسی کا تھا۔ درباروں میں جا کر خوشامد اور چاپلوسی کرنا شعراء کا دستور بن چکا تھا۔ ایسے ماحول میں آتشؔ اپنی شاعری میں بار بار درویش کی حیثیت سے آتے ہیں۔ بادشاہوں کی شان و شوکت کو چیلینج کرتے ہیں۔ انھیں یہ بتاتے ہیں کہ فقیری ہر لحاظ سے بادشاہت سے اعلیٰ درجے کی چیز ہے۔ وہ اپنی فقیری پہ اور اپنی بے سروسامانی پہ نازاں ہیں۔ بادشاہوں کے جاہ و جلال کو بے وقعت سمجھتے ہیں۔

مسندِ شاہی کی حسرت ہم فقیروں کو نہیں
فرش ہے گھر میں ہمارے چادرِ مہتاب کا

تصوف نے آتشؔ کو قلندری کے وہ آداب سکھائے تھے کہ ان کی وسعتوں میں انسانی اقدار کو پناہ ملی۔ ان کے یہاں مذہب اور مذہبیت کا محدود تصور نہیں ملتا۔ مذہبی منافرت پھیلانے والوں کو آتشؔ انسانیت کا دشمن سمجھتے ہیں۔

کفر و اسلام کی کچھ قید نہیں اے آتش
شیخ ہو یا کہ برہمن ہو پر انسان ہوئے

یا

ہم کیا کہیں کسی سے کیا ہے طریق اپنا
مذہب نہیں ہے کوئی ملت نہیں ہے کوئی

دراصل آتش نے فقیری اور درویشی اس لئے نہیں اختیار کی تھی کہ وہ دنیا سے فرار حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس میں انکی فطری آزادروی اور سرکشی کو دخل ہے۔ ان کی فقیری، درویشی اور تصوف دراصل نظام کے خلاف ایک نعرہ انقلاب ہے۔ انھوں نے اپنی مرضی سے بوریہ نشینی اختیار کی جہاں شاہوں کے در پہ سر جھکانے سے نجات ملتی ہے۔

تصوف کے مراحل میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر بھی اہم عنصر ہے۔ صوفیانہ مزاج کے حامل تمام شعراء کے یہاں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر مختلف شکلوں میں ملتا ہے۔ آتش بھی کہتے ہیں۔

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے

آتش کا پیغام بہت واضح ہے۔ دنیا میں جن کے پاس دولت ہے، سامانِ عیش وعشرت ہے، وہ دنیا پہ غرور نہ کریں۔ کیونکہ یہ دنیا فنا ہونے والی ہے۔ جن کے پاس سامانِ عیش نہیں انھیں بھی پریشان اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب کچھ عارضی ہے۔ چونکہ زندگی عارضی ہے اور موت برحق ہے، اس لئے موت کا خیال ان پہ افسردگی طاری نہیں کرتا۔ راہِ تصوف میں موت اگلی منزل ہے۔ آتش بھی اس منزل کے استقبال کو تیار نظر آتے ہیں۔

شعر ڈھلتے ہیں مری فکر سے آج اے آتش
مر کے کل گور کے سانچے میں ڈھل جاؤں گا

آتش کی شاعری میں تصوف کی مقبولِ عام روایات کے ساتھ ساتھ عشقِ حقیقی کے تمام مدارج شامل ہیں۔ عرفانِ نفس، مقامِ حیرت، وحدت الوجود، مقامِ فنا اور رضا و توکل جیسے فلسفیانہ تصورات وعقائد بھی آتش کی شاعری میں جگہ پاتے ہیں۔ اسی لئے کلامِ آتش کو پڑھتے ہوئے ایک مدھم آواز ابھرتی ہے جو صوفیوں کے نعرہ مستانہ میں جذب ہو جاتی ہے۔

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا
شبہ ہو جاتا ہے پردے سے تری آواز کا

8.3.3 متن اور اس کی تشریح

I غزل

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بُلبُلِ بے تاب گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا، شرحِ آرزو کرتے

مِری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے
سفید رنگ ہیں آخر سیاہ مو کرتے

لُٹاتے دولتِ دنیا کو میکدے میں ہم
طلائی ساغر مے نقرئی سبو کرتے

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

یہ کعبے سے نہیں بے وجہ نسبتِ رُخِ یار
یہ بے سبب نہیں مردے کو قبلہ رو کرتے

سکھاتے نالۂ شبگیر کو دراندازی
غمِ فراق کا اس چرخ کو عدو کرتے

وہ جانِ جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی
دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش!
برستی آگ، جو باراں کی آرزو کرتے

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

تشریح:

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بُلبُلِ بے تاب گفتگو کرتے

چمن میں گل اور بلبل ایک عاشق اور معشوق کی طرح رہتے ہیں۔ روایت یہی ہے کہ گل اور بلبل ایک دوسرے پر فریفتہ ہیں۔گل کو عاشق اور بلبل کو محبوبہ کی طرح جانا گیا ہے۔اسی روایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنے محبوب کو گل کے روبرو کردے اور خود بلبل بے تاب سے گفتگو کرے۔ اس شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب گل کی طرح خوبصورت ہے۔ جب محبوب اور گل روبرو یعنی ایک دوسرے کے سامنے ہونگے تو یہ دیکھنا بھی دلچسپ ہوگا کہ کون زیادہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ دوسری طرف گل کے روبرو محبوب کو دیکھ کر بلبل کو ایک تڑپ ہوگی۔ ایسے میں عاشق اور بلبل دونوں کی گفتگو کا لطف ہی کچھ اور ہوگا۔

پیام بر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا، شرحِ آرزو کرتے

عشق کے مرحلے میں عاشق اور معشوق کے درمیان ایک قاصد، پیامبر یا نامہ بر بھی ہوتا ہے۔ جو ایک دوسرے کا پیغام پہنچانے کا کام کرتا ہے۔ عام طور پر تو عاشق اس پیامبر کی بڑی بے صبری سے انتظار کرتا ہے۔لیکن یہاں شاعر نے ایک انوکھے پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ پیامبر کا میسر نہ ہونا ہی اچھا ہے۔ کیونکہ جو کچھ محبوب سے کہنا تھا وہ روبرو کہتے تو کہنے کا لطف تھا۔ زبان غیر سے بھلا کیا شرح آرزو کرتے۔ یعنی اپنے دل کی بات بھلا کسی پیامبر کی زبانی کیوں کر ادا کر پاتے۔ اس لئے پیامبر میسر نہیں آیا تو اچھا ہی ہوا۔

مِری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

شاعر چاند اور سورج کے بھٹکنے کو ان کی آوارگی سے تعبیر کرتا ہے۔ چونکہ شاعر بھی عشق میں مبتلا ہے اور اس عشق کے سبب آوارگی کر رہا ہے۔ ایسے میں جب اسے مہ و مہر یعنی چاند سورج کی گردش کا پتہ چلتا ہے تو اسے ایسا لگتا ہے جیسے یہ چاند سورج بھی کسی حبیب یعنی محبوب کی آرزو میں ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں۔ آسمان میں چاند اور سورج اپنی جگہ جو بدلتے رہتے ہیں کبھی اس سمت تو کبھی اس سمت نظر آتے ہیں گویا یہ بھی ہماری طرح کسی محبوب کی تلاش میں ہیں۔

ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے
سفید رنگ ہیں آخر سیاہ مو کرتے

شاعر کہتا ہے کہ زمانہ ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا ہے۔ بلکہ زمانہ رنگ بدلتا رہتا ہے۔ صبح ہوتی ہے تو شام بھی ہوتی ہے۔ صبح کا اُجالا اگر ہمیں نظر آتا ہے تو رات کی تاریکی بھی دیکھتے ہیں۔ اسی مناسبت سے انسان بھی رنگ بدلتا ہے۔ یعنی شاعر اگر سفید رنگ ہے تو اپنے بالوں کو سیاہ یعنی کالا کرتا ہے۔ یہاں شاعر نے سفید اور سیاہ ایک

مصرعے میں لاکر صنعت تضاد کا استعمال کیا ہے۔

لُٹاتے دولتِ دنیا کو میکدے میں ہم
طلائی ساغر مے نقرئی سبو کرتے

شاعر دنیا کی دولت کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ جو دنیا کی دولت ہے اسے تو ہم شراب خانے میں لٹا دیتے۔ وہ اس طرح کی شراب کا پیالہ سونے کا ہوتا اور شراب رکھنے کا جو مٹکا ہوتا ہے وہ چاندی کا ہوتا۔ اس شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دولت دنیا اسی لائق ہے کہ اسے کسی میکدے یعنی شراب خانے میں لٹا دیا جائے۔ میکدے کے جو لوازمات ہیں یعنی شراب رکھنے کا گھڑا اور جام یعنی پیالہ وہ چاندی اور سونے کا ہو۔

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفو گر رہے رفو کرتے

شاعر اپنے دیوانہ پن کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے خود ہمیشہ اپنا گریبان چاک کیا ہے۔ اپنا گریبان خود پھاڑتے رہے ہیں۔ جو رفو گر تھے یعنی رفو کرنے والے وہ زندگی بھر رفو کرتے رہے۔ اس شعر میں شاعر نے بڑی خوبصورتی سے دل اور دماغ کی جنگ کو بھی بیان کر دیا ہے۔ دراصل شاعر دل کی سنتا ہے، جبکہ عقل مند آدمی دل کے بجائے دماغ کی سنتا ہے۔ دماغ ہمیشہ فائدہ کی بات بتاتا ہے جبکہ دل گھاٹے کا سودا کر لیتا ہے۔ عقل والے یعنی دماغ والے تو رفو کرتے ہیں جبکہ جو دل والے ہیں، جنوں والے ہیں وہ خود اپنا ہی گریباں چاک کرتے رہتے ہیں۔

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

محبوب کی زلف کو اکثر زنجیر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یوں بھی بالوں کی بناوٹ کچھ زنجیر جیسی ہوتی ہے۔ لیکن محبوب کی زلفیں اتنی دلکش ہیں کہ اگر کوئی انھیں دیکھ لے تو وہ ان زلفوں کا قیدی بن جانے کی جستجو کرے گا۔ حالانکہ انسان قید یعنی اسیری سے آزادی چاہتا ہے۔ لیکن یہاں معاملہ اُلٹا ہے۔ محبوب کی زنجیر نما زلفوں میں وہ دلکشی ہے کہ جو آزاد ہیں وہ بھی قید ہونے کی آرزو کرتے۔ محبوب کی زلفوں کو بادل سے اور کالی گھٹاؤں سے بھی موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ زلفیں جب لہرائیں تو گھٹا چھا جاتی ہے۔ اسی کو شاعر نے زنجیر زلف کا عالم کہا ہے۔ اور جب کوئی عاشق اس عالم میں ان زلفوں کو دیکھ لے تو وہ چاہے گا کہ انھیں زلفوں کا قیدی بن کے رہے۔

یہ کعبے سے نہیں بے وجہ نسبتِ رُخِ یار
یہ بے سبب نہیں مردے کو قبلہ رو کرتے

یار یعنی محبوب کے رخ کو کعبہ سے جو نسبت ہے وہ بے سبب نہیں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کا رخ یعنی چہرہ اس قدر پاکیزہ ہے کہ عبادت کرنے کو جی چاہے ہے۔ اس بات پہ غور کریں تو شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے کہ کعبہ خوبصورت بھی ہے اور پاکیزہ بھی۔ ٹھیک اسی طرح محبوب کا چہرہ خوبصورت بھی ہے اور پاکیزہ بھی۔ اب ایک اور

بات کی طرف اشارہ ہے کہ کسی شخص کے انتقال کے بعد اس کے چہرے کو کعبہ کی طرف کر دیتے ہیں۔ اب شاعر یہاں سے ایک پہلو نکالتا ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے فراق میں تڑپ تڑپ کے مرجاتا ہے تو مرنے کے بعد اس کو قبلہ رو کر دیتے ہیں۔ یعنی کعبہ اور محبوب کے چہرے میں جو مشابہت ہے اس کی تکمیل ہوتی ہے۔

سکھاتے نالۂ شبگیر کو دراندازی
غمِ فراق کا اس چرخ کو عدو کرتے

شبگیر یعنی رات کے پچھلے پہر جو فریاد کی جائے اسے دراندازی سکھاتے ہیں۔ چرخ کے معنی ہوتے ہیں آسمان اور عدو کے معنی دشمن کے۔ اب شعر پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ شاعر یعنی عاشق اپنے محبوب کی یاد میں رات کو جاگ رہا ہے۔ رات کا پچھلا پہر ہے اور عاشق اب بھی جاگ رہا ہے اور فریاد کر رہا ہے۔ آہیں بھر رہا ہے۔ اب وہ جس فراق کے غم میں مبتلا ہے اس غم میں آسماں کو بھی شامل کر لیتا ہے۔ یعنی اب آسماں کو بھی اپنا دشمن بنالیتا ہے۔

وہ جانِ جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی
دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے

بہت آسان اور خوبصورت شعر ہے۔ شاعر اپنے محبوب کو جان جاں کہتا ہے۔ اب محبوب کے نہ آنے سے وہ اپنا دل جگر سب لہو کر رہا تھا۔ محبوب اگر نہیں آتا تو پھر موت ہی آتی کیونکہ اس کی یاد میں کب تک کوئی دل اور جگر کو لہو کرتا۔ سیدھا سا مطلب ہے کہ محبوب اگر اپنے عاشق کے پاس نہ آئے تو پھر عاشق کی موت یقینی ہے۔ وہ محبوب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ محبوب پاس نہ ہو تو وہ اس کی یاد میں اپنا دل لہو کرتا رہتا ہے۔ اور یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ بہت دیر تک دل لہو کریں تو موت آجائے گی۔

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتشؔ!
برستی آگ، جو باراں کی آرزو کرتے

یہ اس غزل کا مقطع ہے۔ اس شعر میں شاعر نے اپنا تخلص ''آتش'' استعمال کیا ہے۔ برگشتہ کے معنی ہوتے ہیں پھرا ہوا یا منحرف۔ اور طالع قسمت یا نصیب کو کہتے ہیں۔ شاعر اپنی خراب قسمت کا رونا رو رہا ہے۔ یعنی اس کی قسمت اس قدر خراب ہے کہ مت پوچھو۔ وہ اگر بارش کی آرزو کرتا تو آسمان سے آگ برسنے لگتی۔ اس موضوع کو کئی شاعروں نے الگ الگ ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔ یعنی جب انسان کی قسمت خراب ہو تو بنتا ہوا کام بھی بگڑ جاتا ہے۔ بارش کی دعا کریں تو آگ برسنے لگتی ہے۔ کچھ اچھے کی دعا کریں تو کچھ برا ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب برگشتہ طالعی یعنی قسمت کے خراب ہونے کے سبب ہوتا ہے۔

غزل II

دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

زمینِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گُل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

بہار آئی ہے نشہ میں جھومتے ہیں
مریدانِ پیرِ مغاں کیسے کیسے

تپ ہجر کی کاہشوں نے کیے ہیں
جُدا پوست سے استخواں کیسے کیسے

نہ مُڑ کر بھی بے درد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

توجہ نے تیری ہمارے مسیحا
توانا کیے ناتواں کیسے کیسے

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

تشریح:

دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

شاعر اپنے محبوب سے شکایت کرتا ہے کہ اس کے مُنہ پہ کیسے کیسے گماں یعنی خیال یا وہم اور شک ہیں۔ اسی لیے جب محبوب اپنے عاشق سے بات کرتا ہے یعنی کلام کرتا ہے تو اس کے درمیاں کیسی کیسی باتیں آتی ہیں۔ اگر محبوب کے چہرے پر یہ شک اور وہم نہ ظاہر ہوتے تو عاشق یہ اندازہ نہیں کر پاتا کہ آخر ان دونوں کے درمیان جو گفتگو ہو رہی ہے اس میں یہ عجیب عجیب جملے اور عجیب عجیب باتیں کہاں سے آ رہی ہیں۔

زمینِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

خواجہ حیدر علی آتش کا بہت ہی مشہور شعر ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور تغیر زمانہ کا شکوہ ہے اس شعر میں۔ یعنی شاعر بتا رہا ہے کہ اس دنیا میں ہمیں جو کچھ نظر آ رہا ہے سب بدل جانے والا ہے۔ کچھ بھی پائدار نہیں ہے۔ گل کھلانا محاورہ ہے۔ یعنی یہ جو زمین ہے یہ ایک چمن کی مانند ہے لیکن یہ کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ آسمان کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے۔

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گُل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

شاعر اپنے محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں تنہا ہی تمہاری یاد میں شہید ہونے والا نہیں ہوں۔ بلکہ کیسے کیسے گل و لالہ وارغواں بھی تمہارے شہیدوں میں داخل ہیں۔ ارغواں بھی ایک لال رنگ کا پھول ہوتا ہے۔ گل اور لالہ بھی پھول ہیں۔ پھول میں تازگی، خوشبو اور نزاکت ہوتی ہے۔ پھول معصوم ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں عاشق اپنے آپ کو پھولوں کے ساتھ رکھ کر بات کرتا ہے۔ یعنی اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ ایک میں ہی معصوم تمہاری یاد میں شہید نہیں ہوا ہوں بلکہ اور بھی کئی میری طرح تمہارے لئے شہید ہو چکے ہیں۔ اس شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب بے وفا ہے، اس کی یاد میں صرف ایک نہیں بلکہ کئی لوگوں نے جان گنوائی ہے۔

بہار آئی ہے نشہ میں جھومتے ہیں
مریدانِ پیرِ مغاں کیسے کیسے

اُردو شاعری میں خزاں اور بہار کا ذکر بار بار ہوا ہے۔ بہار آتی ہے تو چہرے کھل جاتے ہیں، ہر جانب مستی کا عالم ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک موسم بہار کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ بہار آئی ہے تو پیر مغاں کے مرید کیسے کیسے جھوم رہے ہیں۔ چونکہ کسی معمولی شاعر کا نہیں بلکہ آتش کا شعر ہے اس لئے بظاہر اس معمولی شعر میں بھی کئی پہلو نکلتے ہیں۔ لفظ پیر مغاں کے دو معنی ہیں۔ شراب بیچنے والے کو پیر مغاں کہتے ہیں۔ یعنی بہار کا موسم ہے اور شراب بیچنے والے کے مرید کیسے کیسے جھوم رہے ہیں یعنی اپنی خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ دوسرا پہلو ہے کہ کیسے کیسے مرید جھوم رہے ہیں۔ لفظ پیر مغاں کا ایک مطلب آتش پرستوں کا پیشوا بھی ہوتا ہے۔ بہار کے موسم میں آتش پرستوں کے پیشوا اور ان کے کیسے کیسے مریدین جھوم رہے ہیں۔

تپ ہجر کی کاہشوں نے کیے ہیں
جُدا پوست سے استخواں کیسے کیسے

شاعر کہتا ہے کہ ہجر یعنی محبوب سے جدائی کا جو تپ یعنی جو حرارت اور گرمی ہوتی ہے اس میں جو کمی آئی ہے اس نے کیسے کیسے جسم سے کھال اور ہڈیوں کو جدا جدا کر دیا ہے۔ کاہش کے معنی ہوتے ہیں کمی کے اور پوست کے معنی ہوتے ہیں کھال یا چمڑے کے۔ اور استخواں کے معنی ہوتے ہیں ہڈیوں کے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہجر میں جو گرمی اور حرارت ہوتی ہے اس میں کمی نہیں ہونی چاہئے۔ ورنہ جسم سے کھال اور ہڈیاں کیسے کیسے جدا ہو جاتی ہیں۔

نہ مُڑ کر بھی بے درد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

اُردو شاعری میں معشوق کو بے درد، بے رحم اور سنگ دل کہا گیا ہے۔ معشوق کے عشق میں گرفتار عاشق اپنی جان دے دیتے ہیں لیکن بے درد معشوق پلٹ کر ایک بار بھی نہیں دیکھتا۔ اسی بات کو شاعر نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔ نیم جاں یعنی ادھ مرا عاشق کیسے کیسے تڑپتا رہا لیکن بے درد قاتل یعنی معشوق نے ایک بار بھی مُڑ کر نہیں دیکھا۔

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

یہ خواجہ حیدرعلی آتش کا بہت مشہور شعر ہے۔اس شعر میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہے۔سکندراور دارا نام کی دو تاریخی شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اس دنیا سے کیسے کیسے نامی گرامی، کیسے کیسے مشہور لوگوں کا نام ونشاں تک مٹ گیا۔مثال کے طور پر سکندر اور دارا کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ سکندر کہاں دفن ہے؟اس کا گور کہاں ہے کسی کو نہیں معلوم جبکہ سکندر فاتح عالم تھا۔اسی طرح دارا کی قبر کا بھی کچھ اتا پتا نہیں ہے۔

بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

بہت سادہ سا شعر ہے۔شاعر کہتا ہے کہ باغ میں بہار کی آمد آمد ہے۔اوراس خوشی میں باغباں خوشیاں منا رہے ہیں۔خوشی پھرنا مطلب خوشی منانا۔ظاہر سی بات ہے کہ یہ دنیا ایک گلستاں کی طرح ہے۔اوراس میں رہنے والے باغباں ہیں۔گویا جب گلستاں میں بہار آئے گی تو باغباں خوش ہونگے۔

توجہ نے تیری ہمارے مسیحا
توانا کیے ناتواں کیسے کیسے

شاعری میں محبوب کو اگر ظالم اور بے درد کہا گیا ہے تو اسی محبوب کو مسیحا یعنی زندہ کرنے والا بھی کہا گیا ہے۔یعنی محبوب اگر محبت اور التفات کی نظر سے دیکھ لے تو مردہ عاشق بھی جی اُٹھتا ہے۔شاعر اپنے مسیحا یعنی اپنے محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے میرے مسیحا تیری توجہ نے کیسے کیسے ناتواں یعنی کمزور کو توانا یعنی اچھا تندرست کر دیا۔

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

شاعر کہتا ہے کہ کوئی اچھی چیز تو اس کے قسمت میں آئی ہی نہیں ہے۔محبوب سے اسے جو کچھ ملا ہے وہ ہے غم، غصہ، رنج ،تکلیف، بدنصیبی اور مایوسی۔یعنی یہی سب ہمارے مہرباں ہیں۔عشق میں اکثر یہی سب سوغات ملتی ہے۔محبوب کی بے وفائی نے یہی سب تحفہ دیا ہے۔اس میں ایک طنز کا پہلو ہے کہ دیکھئے عشق میں کیا کیا چیزیں مجھ پہ مہربان ہیں۔

کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

کہا گیا ہے کہ اس دنیا میں خدا نے جو جو نعمتیں دی ہیں ان کا شکرادا کرنا مشکل ہے۔اسی بات کو شاعر اس شعر میں بیان کر رہا ہے کہ خدا نے کھانے پینے کی کیسی کیسی نعمتیں دی ہیں جس کا ہماری زبان مزے لوٹتی ہے۔اس کے لئے کوئی جس قدر بھی شکر ادا کرے کم ہے۔

8.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

- خواجہ حیدر علی آتش کی زندگی کے حالات اوران کے فن کے بارے میں جانکاری حاصل کی۔
- خواجہ حیدرعلی آتش کے عہد اور ہم عصروں سے واقف ہوئے۔

- خواجہ حیدر علی آتش کے کلام کی قدر و قیمت متعین کی۔
- خواجہ حیدر علی آتش کی دو غزلوں کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ کیا۔

8.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ خواجہ حیدر علی آتش کے عہد کے چار بڑے شاعروں کے نام بتائیے۔

2۔ خواجہ حیدر علی آتش کے کلام کی پانچ خصوصیات بتائیے۔

3۔ خواجہ حیدر علی آتش نے کس اہم شاعر کی شاگردی اختیار کی؟

4۔ خواجہ حیدر علی آتش نے کن کن اصناف میں شاعری کی ہے؟

5۔ خواجہ حیدر علی آتش کے دو اشعار کی تشریح کیجیے؟

8.6 سوالات کے جوابات

1۔ آتش کے عہد کے چار بڑے شاعر ا۔ مصحفی ،۲۔انشاء ،۳۔ناسخ ،۴۔رشک۔

2۔ آتش کے کلام کی خصوصیات: اخلاقی مضامین، تصوف کی چاشنی، مضمون آفرینی، بندش کی صفائی، زبان کی روانی۔

3۔ آتش شاعری میں مشہور شاعر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد تھے۔

4۔ آتش ایک صوفی منش شاعر تھے۔ درباروں سے دور رہتے تھے۔ قصیدہ سے لگاؤ نہیں تھا۔ غزلوں میں خوب چمکے۔

5۔ آتش کے اشعار کی تشریح:

I
یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بُلبُلِ بے تاب گفتگو کرتے

چمن میں گل اور بلبل ایک عاشق اور معشوق کی طرح رہتے ہیں۔ روایت یہی ہے کہ گل اور بلبل ایک دوسرے پر فریفتہ ہیں۔ گل کو عاشق اور بلبل کو محبوبہ کی طرح جانا گیا ہے۔ اسی روایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنے محبوب کو گل کے روبرو کردے اور خود بلبل بے تاب سے گفتگو کرے۔ اس شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب گل کی طرح خوبصورت ہے۔ جب محبوب اور گل روبرو یعنی ایک دوسرے کے سامنے ہونگے تو یہ دیکھنا بھی دلچسپ ہوگا کہ کون زیادہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ دوسری طرف گل کے روبرو محبوب کو دیکھ کر بلبل کو ایک تڑپ ہوگی۔ ایسے میں عاشق اور بلبل دونوں کی گفتگو کا لطف ہی کچھ اور ہوگا۔

II
نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

یہ خواجہ حیدر علی آتش کا بہت مشہور شعر ہے۔ اس شعر میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہے۔ سکندر اور دارا نام کی دو تاریخی شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اس دنیا سے کیسے کیسے نامی گرامی، کیسے کیسے مشہور لوگوں کا نام و نشاں تک مٹ گیا۔ مثال کے طور پر سکندر اور دارا کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ سکندر کہاں دفن ہے؟ اس کا

گور کہاں ہے کسی کو نہیں معلوم جبکہ سکندر فاتح عالم تھا۔اسی طرح دارا کی قبر کا بھی کچھ اتا پتا نہیں ہے۔

8.7 فرہنگ

مہ ومہر	چاند وسورج
مو	بال
طلائی	سونے کا
نقرئی	چاندی کا
اسیر	قیدی
بیاض	سفیدی، کاغذ سادہ
تکمہ	وہ حلقہ جس میں گھنڈی لگائی جائے، گریبان کی گھنڈی
شبگیر	پچھلی رات کا
چرخ	آسمان
عدو	دشمن
برگشتہ	پھرا ہوا، منحرف
طالع	نصیب، قسمت
آتش	آگ
باراں	بارش
دہن	مُنہ
گماں	وہم، خیال، شبہ
ارغواں	ایک ارگن باجا، سرخ اور نارنجی رنگ، ایک سرخ رنگ کا پھول
پیرمغاں	شراب بیچنے والے۔آتش پرستوں کے رہنما
استخواں	ہڈی، گٹھلی
کاہش	کمی، تنزل
حرماں	ناامیدی، مایوسی، بدقسمتی
مسیحا	جو مردے کو زندہ کردے۔حضرت عیسیٰ کا لقب

8.8 کتب برائے مطالعہ

1۔ مقدمہ کلام آتش — خلیل الرحمٰن اعظمی — ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، یوپی، 1990

2۔ خواجہ حیدر علی آتش — محمد ذاکر — ہندوستانی ادب کے معمار، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی 1992

3۔ درس بلاغت — شمس الرحمان فاروقی — قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1997

4۔ غزل اور درس غزل — اختر انصاری — ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1977

5۔ غزل اور غزل کی تعلیم — اختر انصاری — ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، 1995

6۔ تاریخ ادب اردو — رام بابو سکسینہ — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2007

7۔ آبِ حیات — محمد حسین آزاد — اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، یوپی، 2003

8۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ — احتشام حسین — قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1997